ڈاکٹر ظہور الدین احمد

محمد علی رائج سیالکوٹی

محمد علی رائج کے والد کا نام میر دوست محمد تھا۔ وہ بھی شاعر تھے اور صانع تخلص کرتے تھے۔ خزانۂ عامرہ میں ان کا ایک شعر منقول ہے:

بپای برق ہم نتوان رسیدن از حریم او   رہ دور و دراز است ای کبوتر، بال و پر مشکن

خوشگو نے صانع کے دو مزید اشعار اور ایک مصرع نقل کیا ہے:

لب گل خون حسرت خوردن خوردہ چاک گریبانش
بہار لالہ آتش دیدۂ رنگ گلستانش

رنگ بے ہوشی دل ریختہ از دست کسی
می بخون جگر آمیختہ از دست کسی

ع
این قدر تیر تغافل ز کمان خانۂ کیست؟

خوشگو نے صانع کو محمد علی رائج کا بیٹا بتایا ہے جو غلط ہے۔

رائج نے تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی۔ عبدالحکیم حاکم اس کے معاصر لکھتے ہیں:

"از علم و فضل چنداں بہرہ ای نداشت۔ لیکن در فارسی و فن نظم و نثر بسیار ماہر بود و کتابہای دقیق نظم را بدقت درس میگفت۔"

رائج کی عادات و اطوار کے متعلق غلام علی آزاد لکھتے ہیں:

"بسیار شوخ طبع، خوش محاورہ و انجمن افروز بود۔ در شعر خواندن طرز عجیبی داشت و وقت تحسین شعر خود می گفت: "پہ پہ پہ ثم پہ پہ" گاہی میگفت: "سقف خانہ پست، و این شعر بہ بلندی می خواہد۔"

خوشگو نے رائج کے ایک دوست اللہ یار کی زبانی بیان کیا ہے کہ رائج:

"بسیار بے تکلف و شگفتہ پیشانی است۔ مقید ہیچ شی نیست۔ رعذی زن بد ہیئت بطریق

مباسطت با و گفت کہ "میرا گر رجو لیست داری، پیش بیا - فرمود با ای خاتون! مرد بودم۔ اکنون از نگاہِ گرم تو سرد شدم"۔

سرخوش اس کے متعلق لکھتے ہیں :

"مردیست قلندر وضع و آزاد مشرب"،

خان آرزو نے لکھا ہے کہ سیالکوٹ میں ان کی کچھ زرعی اراضی تھی، اسی پر گزران تھی۔ قناعت سے زندگی بسر کرتے تھے اور دوست احباب کی بھی خاطر تواضع کرتے تھے۔

رائج ۲۲ ربیع الثانی ۱۱۵۰ھ کو لاہور میں فوت ہوئے۔ حاکم نے تاریخِ وفات کہی :

رفت رایج بعالم باقی

ان کی نعش سیالکوٹ پہنچائی گئی - بقول حاکم ان کی عمر سو سال کے لگ بھگ تھی۔ ریاض العارفین میں سالِ وفات ۱۱۶۰ھ درج ہے جو صحیح نہیں۔

رائج کے اپنے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی - ایک شعر میں انھوں نے اس کے متعلق اشارہ کیا ہے :

رائج چہ غم کہ صاحبِ اولاد نیستم   از شعر صد ہزار پسر زادۂ من است

رائج کے معاصر اور قریب العصر تذکرہ نگار انھیں استاد شمار کرتے ہیں - وہ اس زمانے کے دیگر استادانِ فن مثلاً فقیر اللہ آفرین، میرزا عبدالقادر بیدل، ناصر علی سرہندی، خواجہ عبداللہ سہامی کے ساتھ ہم طرح غزلیں کہتے تھے۔ آرزو لکھتے ہیں :

"اکثر زمین غزلہا یش طرحی خود است و در بحور غیر مشہور کہ مرزا بیدل گفتہ، اکثر غزلہا گفتہ و خوب گفتہ و داد تلاش دادہ"۔

حاکم نے ان کے متعلق لکھا ہے :

"در شعر طور تازہ دارد۔ معنی بند و مضمون یاب است"

خوشگو نے لکھا ہے کہ آرزو نے رائج کا دیوان پڑھ کر مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا :

"خیلی صاحبِ مذاق و تلاش و بفارسی آشنا بنظر آمد۔ بتازگی و بنازکی می گوید"

احمد علی کی رائے ہے :

"سخنش از لطافت خالی نیست - معنی ہائے رنگین و اشعار پر مضامین و براست کہ در گفتن نمی آید - اشعارش پختہ و بسرحدِ کمال رسیدہ"

دیوان

جس روز خوشگو لاہور پہنچا، اسی روز رائج وفات پا گئے - چنانچہ وہ جنازے میں شریک ہوا۔ لاہور میں اس نے رائج کا دیوان پڑھا - دہلی جا کر آرزو سے ذکر کیا - انند رام مخلص نے خاص طور پر ان کا دیوان سیالکوٹ سے منگوایا اور آرزو کو مطالعہ کے لیے دیا - آرزو لکھتے ہیں: "دیوان میں بیس ہزار کے لگ بھگ اشعار ہوں گے"۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیوان کا مخطوطہ ۳۶۸ ورق پر مشتمل ہے - ہر صفحے میں انیس سطریں ہیں - خط باریک نستعلیق ہے - اس میں ۳۲۰ ورق تک غزلیات ہیں - ۳۲۱ کے بعد قصائد در منقبت حضرت علی و ائمہ اطہار اور در تعزیت و مرثیت امامین ہیں - مثلاً دو قصائد کے مطلع ملاحظہ ہوں:

می ترا دو از زبان مرد و زن ای وا حسین   میکند گل از لبِ طفلانِ بیغم یا حسین
باز عاشور آمد و دل خون شد از دردِ امام   گریۂ ہر مومنی جیحون شد از دردِ امام

۳۴۵ سے ۳۴۹ تک مثنوی در منقبتِ حسین ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:

حسین آن قرۃ العین حیدر   جگر پارۂ زہرا و حیدر
زمین را جملگی از گریہ تر کن   وگر ماند کفِ خاکی بسر کن

۳۴۹ اور ۳۵۰ پر رباعیات مندرج ہیں - ۳۵۲ سے ۳۵۳ تک ترجیع بند ہے، جس کا ترجیعی شعر یہ ہے:

ای یزید ابن یزید ابنِ یزید   چون تو کافر نسب امروز کہ دید

۳۵۳ سے ۳۵۶ تک قطعات تاریخ، ۳۵۶ سے ۳۶۷ تک مثنویات ہجویہ و دعائیہ، ۳۶۷ اور ۳۶۸ پر مثنوی درج ہے جس کا موضوع اس شعر سے ظاہر ہے:

زمکرِ زن بزیر چرخ گردان   بخاک آمیخت آب روی مردان

رائج آزاد مشرب تھے لیکن ائمہ اطہار کی منقبت اور تعزیت میں جو اشعار لکھے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ وہ مائل بہ تشیع تھے - مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ ذیل کا شعر مزید اس پر شاہد ہے:

غمم فگندہ زپا یا علی ولی اللہ — بگیر دستِ مرا یا علی ولی اللہ

معلوم ہوتا ہے کہ انھی عقائد کی بنا پر لوگوں نے انھیں رافضی کہا۔ چنانچہ اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں اور خود کو اس الزام سے بری قرار دیتے ہیں:

خارجی چندز ارباب ستم — میکنند اینجا برفضم متہم
سنیم یعنی غلامِ چار یار — مدح خوانِ جملہ اصحابِ کبار
لیکن اخلاصم بود با آن جناب — رفض نتوان گفت حبِ بوتراب

رائج اگرچہ کسی امیر یا حاکم کے دربار سے وابستہ نہیں تھے البتہ ان کی مجالس ادبی میں ان کا گزر ضرور تھا۔ امراء ان کی قدر کرتے تھے جیسا کہ آزاد بلگرامی کے ایک بیان سے ظاہر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

خواجہ محمد فاضل خان غبار تخلص برادر زادۂ سیف الدولہ عبد الصمد خان ناظم لاہور نے محمد علی رائج سے کہا، کسی کا یہ مصرع مشہور ہے:

اے حنا انگشت فندق بند داد از دستِ تو

اس پر دوسرا مصرع لگانا چاہیے۔ رائج نے اسی وقت یہ مصرع لگایا:

از کمانِ ناخنی خوردم خدنگ از شستِ تو

خان مذکور نے اس مصرع کے لیے ستر روپے انعام بھجوایا۔

سیف الدولہ عبد الصمد خان ناظمِ لاہور ۹ ربیع الثانی ۱۱۵۰ھ یعنی رائج کی وفات کے ستر دن پہلے وفات پا گئے۔ رائج نے لکھا:

کہ می گو بد ترا عبد الصمد خان از جہان رفتی — زمین انگیخت گرد و گلفتی بر آسمان رفتی
فلک تخت و ملائک لشکر و انجم سپاہت شد — پی فرمانروائی ہائے ملکِ جاودان رفتی

کفایت خاں کی مدح میں بھی ذیل کے دو شعر ایک غزل میں موجود ہیں۔ اس امر سے بھی کچھ نہ کچھ نسبت و رابطہ ہوگا:

شکوہِ دولت دنیا و دین یعنی کفایت خاں — کہ قیصر بر جنابِ ہمتش از سائلان بادا!
دعا ہائے کہ دارم بہر جاہت کمترین اینست — کہ خان یارب وزیرِ کشورِ ہندوستان بادا

مغلیہ امرا میں سے کفایت خاں لقب کے کئی امرا تھے لیکن عالمگیری امرا میں سے جعفر بیگ

کفایت خاں زیادہ نامور معلوم ہوتے ہیں قیاس ہے کہ رائج کے پیش نظر یہی صاحب ہوں گے جن کا ذکر کیول رام نے تذکرۃ الامرا میں یوں کیا ہے :

"در سنہ سیزدہم مکرر بدیوانی تن مقرر گشتہ و در سنہ ۱۶ بعد استعفائی اسد خان از نیابت وزارت بنا بر اجرای کار دیوانی اعلیٰ بایں عنایت محل عنایت گردید مقرر شدہ بود کہ پائین تر از مہر دیوان اعلیٰ مہر خود بر پروانجات دفتر میکردہ باشد۔ در سنہ ۱۸ دیوانی خالصہ ضمیمہ تن سر بیا فراختہ و در سنہ ۲۰ از دیوانی خالصہ تغیر گردیدہ تا سنہ ۲۴ دیوانی تن مامور ماندہ و در سنہ ۲۸ رحلت کردہ۔"

رائج نے ایک اور صاحب شکر اللہ خان کی بزم سخن کا ذکر کیا ہے جس میں غزل خوانی کو وہ اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں ۔ انھوں نے لکھا ہے :

شود رائج سمندر عندلیب از آتش غیرت اگر در بزم شکر اللہ خان بیند غزل خوانت

شکر اللہ کے چار امرا کا ذکر ملتا ہے ممکن ہے زیادہ بھی ہوں ۔ قیاس ہے کہ رائج کے پیش نظر ذیل کے دو اشخاص میں سے ایک صاحب ہوں گے :

۱۔ شکر اللہ خان ولد جعفر خان برادر باقر خان نجم ثانی در زمان عالمگیر بخطاب خانی سربلند شدہ بود در سنہ ۲۵ از انتقال فولاد خان بفوجداری میوات مقرر گشت از سنہ ۲۷ بخطاب عسکر خان نامور گردید۔

۲۔ شکر اللہ خان خویش عاقل میر عسکری منصبی داشت ۔ در سنہ ۳۱ عالمگیری بخطاب و بفوجداری شاہ جہان آباد افتخار یافتہ بود۔"

معاصر شعرا میں سے رائج نے میر جمال الدین کا نام لیا ہے ۔ اس سے مراد میر جمال الدین سیادت لاہوری ہو سکتے ہیں جو ۔۔ آتک زندہ تھے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

یارب از معنی قبولش دہ جو رائج کز وطن ۔ ایں غزل نذر جمال الدین محمد بردہ ام ۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

رائج ایں شہر تم از میر جمال الدین است

گل رعنا میں مذکور ہے کہ وہ کشمیر بھی گئے ۔ سری نگر میں پانچ روز ٹھہر کر سیالکوٹ واپس آگئے ۔ اس وقت کے حاکم ابو البرکات خان سے بھی ملاقات ہوئی ۔ اس کا داماد رائج کا شاگرد تھا ۔

یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ راسخ کس سال کشمیر گئے۔ مذکورہ ابو البرکات خاں سب سے پہلے ۱۱۳۳-۱۱۳۴ھ میں نائب صوبیدار کشمیر تھے۔ اس کے بعد ۱۱۳۷ سے ۱۱۴۰ھ تک نائب صوبیدار رہے۔ بعد میں بھی آٹھ نو سال نائب صوبیدار رہے۔ قیاس کہتا ہے کہ راسخ ۱۱۳۳-۱۱۳۴ھ میں کشمیر گئے ہوں گے۔ کیونکہ اس سال بھی وہ کافی عمر رسیدہ تھے۔ یعنی اس وقت ان کی عمر ستر بہتر سال ہو گی۔ اس سے زیادہ بڑی عمر میں کشمیر جانا ناتوان کے لیے اور بھی مشکل ہوگا۔

نشترِ عشق میں لکھا ہے کہ وہ دہلی گئے۔ میرزا بیدل اور شاہ آفرین سے صحبتیں رہیں۔ کچھ عرصہ ٹھہر کر واپس چلے گئے۔

اوپر ہم نے معاصر یا قریب العصر تذکروں سے راسخ کے احوالِ زندگی تلاش کیے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے لیکن ان تمام میں انہی تذکروں سے معلومات اخذ کی گئی ہیں اور معلوم اطلاعات میں اضافہ نہیں ہوا:-

تذکرۂ حسینی، ص ۱۳۵۔ ریاض العارفین، ص ۱۳۱۔ شمع انجمن، ص ۱۷۰۔ تذکرۂ بے نظیر ص ۶۷ ریاض الشعرا، ص ۱۲۹۔ سرو آزاد، ص ۲۰۴۔ مخزن الغرائب، ص ۴۲ (قلمی)۔ مآثر الکرام، ج ۲، ص ۲۴ انیس العاشقین، ص ۱۹۲ ب (قلمی)، ہمیشہ بہار۔

مروجہ انداز میں راسخ صوفی تھے اور وحدت الوجود کے قائل تھے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار دیکھیے:

ہم زلیخا و ہم قافلہ و ہم یوسف ای خریدار خود این گرمی بازار چند
کو جبینی کہ درو نور رسش نیست دہر یک بزم چراغان شدہ است

چشتیہ صوفیہ کی طرح وہ سماع کے قائل تھے:

صوفی عشقم مرا راسخ سماعی آرزوست سوختم از انتظار و قائلی پیدا نشد

مراحل تصوف میں ابتدائی اقدامات ترک مال و زر، ترک خواہش اور ترک شہرت ہیں۔ راسخ کے کلام میں جا بجا یہ افکار نمایاں ہیں۔ مثلاً:

چو در فقر و قناعت سیم و زر افگندی از چشمش مکن کوتاہ یارب ہمت مردانۂ راسخ
از گداز عشق ربط دل بگو نیستم نماند چوں دو ساحل از دو جانب بردہ این دریا مرا
ہمچو روح از بدنت بگسل و معراج بہ بین از تہ افلاک بیک چشم زدن بیروں رو

آب تیغ عشق پاکم شستہ است از لوث شرک بہر نفی غیر شد زخم نمایاں لا مرا

ان کے کلام سے ظاہر ہے کہ ان کا دل دردِ عشق کی نعمت سے مالا مال تھا، وہ کہتے ہیں :

بیقرار بہانے دل در عشق باشد دینِ ما جیب تمکین پارہ کردن رسم و آہ آئینِ ما

دردمندی ہمچو من از عشقبازان بر نخاست از نم اشک و غبارِ غم خمیرم کردہ اند

ہمچو سیمابی کہ بہ آتش نمی گیرد قرار دل ز سوزِ عشق سیرِ عالم بالا کشد

وہ داغِ محبت سے ہمہ تن سوختہ تھے :

عاقبت داغِ محبت رائج تمازتِ شعلہ چو خس کرد مرا

مرا عشق بگداخت با جملہ تمکین بہر سو چو سیلی ز کہسار رفتم

رائج مردِ مومن کے بلند مقام سے آگاہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کے بیش بہا لمحات گردشِ صبح و شام میں الجھ کر نہ رہ جائیں یا دنیاوی و مادّی لذات کی محویت میں نہ گزر جائیں۔ وہ کہتے ہیں :

بحق وحدت کہ جلوۂ دوست از تو پیداست دیدہ واکن

عبث چہ گردیدہ ای چو رائج اسیرِ امروز صیدِ فردا

وہ انسان کو اس کا مقام یاد دلا کر اسے متنبہ کرتے ہیں :

چند محوی در صفای خانۂ دیوان لبفرش جبرئیل از شہپرش بر عرش روبد جای تو

جب انسان کا پایہ بلند ہے تو اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی ادنیٰ خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی دوسرے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ یہ اس کی خودداری اور غیرت کے منافی ہے۔ وہ کہتے ہیں :

ز اہلِ دولت گر نہ ای خم در سلام کس مباش صاحب کس چون نکردند غلام کس مباش

استخوانی شو ز جوع و چون ہما کن قوت ازو چون مگس ناخواندہ حاضر بر طعام کس مباش

زندگی کی بلند اقدار کا مالک ہوتے ہوئے انسان پر فرض ہے کہ وہ بنی آدم کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ خود نیک بنے۔ دوسروں کے ساتھ نیکی کرے اور خندہ پیشانی سے پیش آئے :

تو نیک باش کہ عالم شوند آئینہ است دگرنہ کیست کہ در دہر بد معاملہ نیست

سر کن ہمیشہ با ہمہ کس خندہ رو ز خلق محروم فیض گستری این سحر مباش

رائج نے اپنے زمانے کی ناقدریٔ فن کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امرا بخیل ہیں اور جاہل ،

اس لیے شعرا کی قدر دانی اور قدر افزائی نہیں ہوتی - چونکہ رائج خود دار واقع ہوئے ہیں اس لیے وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں :

شاعرم کردی چہ رائج لاو بالی کن مرا ننگم آید التجا با این کریمان لئیم
چقدر قافیہ بر اہل سخن تنگ آمد اغنیا دشمن شعر اند درین عہد زجہل
جوہر از آئینہ مار بخود می پیچد رائج از کوری مردم شدہ پنہاں ہنرم
کنارہ گیر ترا از خری لگہ برسد چہ محو صحبت مستان دولتی رائج

رائج کے زمانے میں عموماً تقلید اور روایت کی رسمی پابندی کا چلن تھا لیکن استادانِ فن اس کا گلہ کرتے ہیں کہ قلیل البضاعت قسم کے شاعر ان کے مضامین چرا کر اپنا لیتے ہیں - یہ بات بہت معیوب سمجھی جاتی تھی - جمال الدین سیادت نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

چون نگین از شعر مردم نام پیدا می کنند این سخن دزدان سنگین دل کہ دعوی مے کنند

رائج اس سلسلے میں کہتے ہیں:

حفظ کن یارب ز دست انداز سگ خوانِ مرا بر معانی سخت میلرزم از دزد بدگہر

رائج نے اپنے کلام کی خوبیوں میں سے نازکی خیال، رنگینی بیان اور تازگی فکر کی طرف توجہ دلائی ہے - ان کے اشعار میں لفظی زیبائش کے ساتھ ساتھ جذبے کی آمیزش بھی ہے - علامہ اقبال نے کہا ہے:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

رائج بھی داغِ دل اور خونِ جگر کی باتیں کرتے ہیں:

کو شعر کہ داغِ دل و خونِ جگر است این از درد چہل سالۂ فکرم جگر است این

کلام کی رنگینی کے متعلق رائج نے بڑے معنی خیز انداز میں تشریح کی ہے :

شعرم ہمہ بوی گل و من دفتر رنگم تلوین چمن آرای سخن محشر رنگم
ز آتش کدۂ فکر گدازش مگر رنگم صباغ لباس سخن آسان نتوان شد
بیرنگم و چون وانگرم مظہر رنگم جمع آمدہ حوران معانی بکنارم

اپنے طرزِ سخن اور تازگی بیان کے متعلق فرماتے ہیں:

بی تکلف نازکیہای خیال اینست وبس در گفتن رائج عجب طرز نوی افتادہ است

در تازگی از شعر نرم آب روانست | ترتیب بدیوان چه دہد کس سخنم مرا
از حلاوت بخشی طرز سخن در ملکِ فکر | ہمچو رائج خسرو شیریں کلامم کن مرا

شعر کی تکوین و تخلیق، ریاضتِ فکر اور مقصدیت کے متعلق، رائج نے ایک غزل میں اپنی شاعری پر مفصل تبصرہ کیا ہے جو یادداشت کے قابل ہے:

فروغ دیده می بخشد چو فرزند خلف شعرم | ز مصرع داده میل سرمه آلودی بکف شعرم
به پہلو از سطورم صفحه گوئی ترکش تیر است | که ساز د سینۂ حاسد مشبک چوں ہدف شعرم
بود ہر مصرعِ شوخم دوالِ طبل شہرتہا | جہان را کرده دیوان قیامت از شغف شعرم
کلام من بچشم کم مبین حکم فنا دارد | کرامت کرده انداز حضرت شاہ نجف شعرم
پدر را کی غنائی یہ ز فرزند عزیز آمد! | چه شد ز افلاس کرد اسباب دنیا را تلف شعرم
باوجی رفته از توحید و نعت و منقبت قدسش | که خط سرنوشت جبرئیل است از شرف شعرم
بہاری کرده معنی در ریاض فکرتم رآئج | که از شہرت چو بوی گل دود در ہر طرف شعرم

زمانے کے رواج کے مطابق رائج نے مشکل بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ قدرت کلام دکھانے کے لیے ردیف کا التزام بھی کیا ہے مگر اس سے کلام میں زیادہ تکلف اور تصنع نہیں آیا۔ مثلاً دو تین ردیفیں یہ ہیں:

در صحرا، آئینہ را، غنچہ را۔

معنی آفرینی اور معنی یابی تو اس دور کا مخصوص شیوہ رہا ہے۔ نئے معانی کی تلاش میں تخیل میں پیچیدگی اور بیان میں عدم صراحت اس طرز کا خاصہ ہے۔ مبالغہ سے بھی اکثر کام لیا جاتا تھا جس سے نئے معانی پیدا کرنے میں مدد ملتی تھی۔ مثلاً رائج کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ز اشک گرم چه آتش به بحر زد رآئج | که یک قلم شده ماہی کباب در تہِ آب

مثالیہ شیوۂ بیان بھی اس دور کا امتیازی نشان رہا ہے۔ کہیں کہیں رائج نے بھی اس سے کام لیا ہے اور اچھے شعر نکالے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

دل که از عشق نشد شق نشود مظہر راز | تا شگافی بقلم نیست رقم ممکن نیست
مرد را دنیا و دین ہر دو بہم ممکن نیست | تا بود بت به بغل طوف حرم ممکن نیست

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہر ہے، رائج کے دل میں درد و سوز ہے اور یہی غزل کی جان ہے۔ محبوب کے فراق میں تپش اور کسک کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اگر شاعر اس سے محروم ہو تو غزل پھیکی اور بے کیف ہوتی ہے۔ عاشق کا دل تڑپتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی تڑپاتا ہے۔ رائج کے دل کی کیفیت دیکھنی ہو تو اس کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھیے:

طپید و خون شد و از غم بجان رسید دلم — ز دوری تو چگویم چہا کشید دلم
چو مرغ تو بقفس او فتادہ بی تو دمی — درون سینۂ چاکم نیارمید دلم
تمام رنگ ز خون و تمام بوی ز آہ — بباغ عشق تو چوں خود گلی نچید دلم
در آب جا نکند عکس وقت لرزیدن — جمال یار ز جوش طپش ندید دلم

رائج کا عشق تجریدی نہیں بلکہ جارحانہ قسم کا ہے اور یہ عشق ایسا نہیں جو جوانی تک محدود رہتا ہے بلکہ بڑھاپے میں بھی اس کی تندی ختم نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں:

پیرم منکر حوصلۂ صحبت من کو — بکیفیت تند لیست شراب کہنم را
در آغوش کشم امرد ز رائج ہر چہ بادا باد — بود ہر چند پیچ و تاب آن نازک میان پیدا

قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے رائج کا احساس لطیف ہے۔ بہار کے موقع پر اسے ہر چیز ناچتی، گنگناتی نظر آتی ہے۔ چمن کی ہر شے مسرت انگیز اور روح پرور ہے۔ زاہد خشک مزاج کے دل میں بھی ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ فارسی شاعری میں قدرت کی رعنائیوں سے لذت اندوز ہونے کا گہرا احساس کہیں کہیں امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔ ایک قصیدے کی تشبیب ہے۔ ہم رائج کے چار اشعار نقل کرتے ہیں جن سے ان کے جمالیاتی احساس کا اظہار ہوتا ہے:

تا چہ بزم طربی طرح نمود ست بہار — برگ برگ چمن آمد چو جلاجل بصدا
گل چو بلبل بہوا بال فشاند ز طرب — خار از طپش چو منقار کند زمزمہا
شعلۂ آتش بے دودِ گل اندوہ گداز — نغمۂ بیغزمن مرغ چمن روح فزا
زاہد از اوج جنون زمزمۂ عشق بلب — رند از موج قدح سلسلۂ عشق بپا

غزل کی خوبی یہ ہے کہ اس کی بحر ہلکی پھلکی اور رواں ہو۔ موسیقی سے بھی ہم آہنگ ہو۔

بھاری بھر کم الفاظ نہ لائے گئے ہوں۔ تخیّل میں صراحت ہو۔ بھرتی کے اشعار نہ بڑھاتے ہوں۔ ہر شعر میں فکر کا ایک نہ ایک حسین زاویہ عیاں ہو۔ ان مختصات کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو رائج کی بہت سی غزلیں اس معیار پر پوری اتریں گی۔ نمونے کے طور پر ہم اس کی مندرجہ ذیل غزل نقل کرتے ہیں:

از وصل حسرتِ دلِ ما کم نمی شود — حرصِ گدا بہ برگ و نوا کم نمی شود
صد سیلِ اشک از تہ این پل گذشتنی است — عشقِ بتاں بہ بہشت دوتا کم نمی شود
باشد ز سرد مہریِ احباب رعشہ ام — سرما ہم از ہزار قبا کم نمی شود
دستِ دعا مکن سپرِ ناوکِ قضا — تسلیم شو، ز عجز بلا کم نمی شود

ماخذ

۱۔ خزانۂ عامرہ، غلام علی آزاد، مطبع نولکشور، کانپور،
۲۔ دیوان محمد علی رائج، نسخہ خطی پنجاب یونیورسٹی لائبریری، شمارہ ۲۳۹،
۳۔ تذکرۂ مردم دیدہ، عبدالحکیم حاکم، لاہور، ۱۹۶۱
۴۔ تذکرۃ الامرا، کیول رام، نسخہ خطی پنجاب یونیورسٹی لائبریری شمارہ ۴۸۷
۵۔ سفینۂ خوشگو، بندرابن داس، پٹنہ، ۱۹۵۹،
۶۔ کلماتِ شعرا، محمد افضل سرخوش، لاہور، ۱۹۴۲،
۷۔ مجمع النفائس، سراج الدین علی خان آرزو
۸۔ ریاض العارفین، رضا قلی ہدایت، تہران
۹۔ گلِ رعنا، شفیق اورنگ آبادی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مجموعہ شیرانی، شمارہ ۴۹
۱۰۔ نشترِ عشق، حسین قلی خان، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری،
۱۱۔ مخزن الغرائب، احمد علی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مجموعہ شیرانی،

ارمغانِ حالی

منتخبہ و مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان مرحوم

یہ کتاب شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی کی تمام نظم و نثر کے انتخاب اور اس انتخاب کی برمحل تشریح و توضیح پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ مولانا حالی کی اس عظیم الشان فکری و تخیلی کاوش کا آئینہ ہے جس کی بنیاد پر مولانا نے نصف صدی سے کچھ زیادہ مدت تک تعمیرِ قوم کی کوششوں کو جاری رکھا۔ حالی کے مشہور و معروف تنقیدی و سوانحی کلام کے علاوہ متفرق موضوعات پر مولانا کے جواہرِ انشا منابب تلاش و تفحص سے حصۂ نثر میں چن دیے گئے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے دینی، تعلیمی اخلاقی اور معاشرتی مضامین کے سیر حاصل اقتباسات شاملِ کتاب ہیں اور ہر ایک اقتباس کے سالِ تصنیف کی صراحت کر دی گئی ہے۔ یہی عمل حصۂ نظم میں بھی جاری ہے۔

کتاب کے آغاز میں ایک مفصل اور پُراز معلومات مقدمہ ہے جو متن کے تمہیدی اشارات اور تشریحی حواشی سے الگ اپنی ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔

صفحات : ۳۱۶ قیمت قسم اول : ۱۴ روپے

" " دوم : ۹ روپے

ملنے کا پتہ : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور